اقبال اور اقبالیات......ایک مطالعہ

ڈاکٹر خالد ندیم

بھارتی صوبے اتر پردیش کے علاقے پہاڑ پور (مچھلی شہر، ضلع جون پور) میں پیدا ہونے والے عبدالحق کی ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول، مچھلی شہر میں ہوئی۔ میٹرک کے بعد پی ایچ ڈی تک ان کی ساری تعلیمی منزلیں گورکھ پور میں طے ہوئیں۔ ملازمت کی ابتدا دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ ہوئی اور صدرِ شعبہ کی حیثیت سے وہ یہیں سے سبک دوش ہوئے۔

مذہبیات اور کلاسیکی شعر و ادب سے شغف رکھنے والے عبدالحق کو ابوالاعلیٰ مودودی، حافظ، شاہ حاتم، مرزا غالب، علامہ اقبال، شبلی نعمانی اور رشید احمد صدیقی کی تخلیقات سے خصوصی رغبت ہے؛ البتہ اقبالیات سے انھیں جنون کی حد تک دلچسپی ہے۔ اس سلسلے میں تصنیف و تالیف کے علاوہ بین الاقوامی اقبال کانفرنس کا اہتمام بھی کر چکے ہیں۔

اقبالیاتی حوالے سے ان کی تصانیف و تالیفات میں اقبال: ابتدائی افکار (۱۹۶۹ء)، تنقیدِ اقبال اور دوسرے مضامین (۱۹۷۶ء)، فکرِ اقبال کی سرگذشت (۱۹۸۹ء)، اقبال کے شعری اسالیب (۱۹۸۹ء)، اقبال کی شعری و فکری جہات (۱۹۹۸ء)، اقبال اور اقبالیات (۲۰۰۶ء، ۲۰۰۹ء) اور اقبال: شاعرِ رنگیں نوا (۲۰۰۹ء) شامل ہیں؛ جب کہ *Stray Reflections* کا اردو ترجمہ بکھرے خیالات (۱۹۸۸ء، ۱۹۹۱ء) بھی قابلِ ذکر ہے۔

اس وقت ان کی قابلِ قدر اور وقیع تصنیف اقبال اور اقبالیات زیرِ مطالعہ ہے۔ کتاب میں ان کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مضامین شامل ہیں، جو بیدل، سرسید، غالب، انیس، آزاد، کیفی، تصوف یا تحقیق کے موضوعات پر منعقدہ مذاکروں میں پیش کیے گئے تھے۔

”اقبال اور مقامِ شبیری“ کتاب کا پہلا مضمون ہے۔ انیس و دبیر کے بعد شخصی مرثیوں کو مصنف نے حالی کا شعری اجتہاد قرار دیا ہے، جس کی تقلید و توسیع میں اقبال نے داغ، والدۂ مرحومہ اور راس مسعود کے مرثیوں اور شبلی، حالی اور سوامی رام تیرتھ سے متعلق مرثیہ نما نظموں کے ذریعے کئی تازہ امکانات کی نشان دہی کی۔ نظم ”فاطمہ بنت عبداللہ“

میں شوقِ شہادت کی نشان دہی کرتے ہوئے، مصنف نے مرثیے کو فکری بلندی عطا کرنے پر اقبال کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ مصنف کے خیال میں اقبال نے مرثیے کے مروّجات کو نظر انداز کر کے اسما و اماکن کے ساتھ حادثے کی سنگینی اور پیغامِ شہادت کو نفسِ موضوع بنایا ہے۔ حضرتِ حسین کی شخصیت اقبال کے تصورِ مردِ مومن کو بنیاد فراہم کرتی ہے، چنانچہ مصنف نے اقبال کے قلب و نظر پر اس شہادت سے مرتبہ اثرات کا جائزہ لیا ہے اور قرار دیا ہے کہ اقبال کو مناظرِ فطرت کا وہی شاہ کار محبوب ہے، جو حسینی نسبت رکھتا ہے؛ چنانچہ کلامِ اقبال میں اس عظیم شخصیت اور ان کے شعارِ زندگی کا ذکر ناگزیر طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ مضمون اپنے اختتام تک پہنچتے پہنچتے جذباتی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

''اقبال کے عمومی اثرات'' میں مصنف نے اقبال کو ایک ایسی ہستی قرار دیا ہے، جو عصری میلانات پر قدرت حاصل کر کے مروّجہ دھاروں کا رُخ موڑ دیتی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اقبال کی طرف سے شعر و فلسفہ کے امتزاج کو جذبہ و احساس کی زبان میں ڈھال دینے کو اعجوبہ قرار دیا ہے۔ مصنف کا یہ کہنا بجا ہے کہ عوامی سطح پر اقبال کے بہت سے اشعار ضرب الامثال بن گئے ہیں اور زبان زدِ عام اشعار میں سب سے زیادہ تعداد کلامِ اقبال سے ہے؛ چنانچہ ان کے خیال میں صحائف کے بعد، سب سے زیادہ پڑھے جانے والے تخلیقی ادب کا تعلق اقبال سے ہے۔ (ص ۱۸)

اقبال کے ہاں شعری اظہار فکرِ خالص کو جذبے کی زبان بخش دیتا ہے، چنانچہ اقبال کے مخالف بھی ان کی شاعری کی سحر آفرینی سے نہیں نکل پاتے۔ مصنف نے شعری اعتبار سے جوش، فیض اور فراق؛ تنقیدی شعبے سے مجنوں گورکھ پوری، ڈاکٹر گیان چند جین، مشفق خواجہ، رشید حسن خاں، محمد حنیف نقوی اور کلیم الدین اور اجتہادی حوالے سے سید سلیمان ندوی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ابوالحسن علی ندوی، عبدالماجد دریابادی اور علامہ خمینی جیسے بالغ نظر علما کا ذکر کیا ہے۔ مصنف کے خیال میں، بیسویں صدی میں برعظیم کے مسلم دانش وروں کی بڑی تعداد اقبال کے نیاز مندوں کی ہے۔ مصنف نے لیبیا، ماریشس، پاکستان، کشمیر اور بھارت کی سرکردہ شخصیات پر اقبال کے اثرات کو دلائل سے ثابت کیا ہے۔ یہ مضمون بھی اپنے اختتام تک آتے آتے جذباتی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

''اقبال کا شعری آہنگ'' میں مصنف نے اقبال کے ہاں فلسفہ و فکر کی گہرائی اور لطافتِ فن سے ہم آہنگی، پھر اس امتزاج سے پھوٹنے والے غیر محسوس سوز و گداز کے حامل نغمات اور جلال و جبروت کی پُر وقار آوازوں کے تین زاویوں کی نشان دہی کی ہے، گویا اقبال نے خیال کی فکر انگیزی کو الفاظ کی صورت میں ڈھال کر صوت و صدا سے آراستہ کیا ہے۔ مصنف نے بیش بہا کلاسیکی ادب پر گہری نظر اور اس کے اسالیب و اظہار کے بھرپور عرفان کے باعث اقبال کے آہنگ کو جدید اردو شعرا میں سب سے زیادہ کلاسیکی قرار دیا ہے۔ اس کلاسیکی آہنگ میں فارسی اور عربی ادب کے کردار اور ان کے شعری آہنگ کے دیگر عناصر کی پردہ کشائی کر کے بجا طور پر کہا ہے کہ اقبال کے اکتسابات اور عظیم تخلیقی سرچشمے نے نغمہ و آہنگ کی بے کراں دُنیا کو شاعری میں سمو دیا ہے۔

''سرسید ـــ مصدرِ اقبال'' میں مصنف نے اقبال کو سرسید کے مشن کی تجدید اور توسیع قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ سرسید کے علم و عمل نے افکار کی آویزش کا جو سیل پیدا کیا تھا، اسے مربوط اور منظّم فکر کی صورت اقبال نے دی۔ (ص ۴۹) دراصل یہ سارا مضمون اسی بیان کی وضاحت میں لکھا گیا ہے۔

''اقبال کی غالب شناسی'' میں مصنف نے اقبال و غالب کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے کہ انھوں نے ہمارے شعر و ثقافت کو آفاقی اساس بخشی ہے اور ہمیں دنیا کی بڑی تخلیقات کے رُوبرُو ایک تفاخر کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ (ص ۶۰) اقبال کے ہاں کلاسیکی شعرا سے اخذ و استفادے کے احساس سے، ڈاکٹر عبدالحق کے خیال میں، یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ان کا کلام مستعار و مستفادفن کا مجموعہ ہے، [بلکہ] استنباط اور استفادے کی یہ بے کراں بوقلمونی ان کے مطالعے و مشاہدے اور امعانِ نظر کی شہادتیں پیش کرتی ہے۔ (ص ۶۷) اقبال کے ہاں غالب کے اعترافِ عظمت کا اظہار ابتدا سے آخری ایام تک محیط ہے۔ شاعری، خطوط، مضامین، خطبات، ملفوظات، غرض اقبال ہر مقام اور ہر موقعے پر غالب سے قریب محسوس ہوتے ہیں۔ مصنف نے الطاف حسین حالی (یادگارِ غالب) اور عبدالرحمٰن بجنوری (محاسنِ کلامِ غالب) کے درمیان اقبال کو ایک سنگِ میل قرار دیتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ اقبال سے بڑھ کر نہ کوئی غالب شناس ہے اور نہ ہی غالب کی صحیح منزلت سے آگاہ۔ (ص ۷۷) یہ مضمون اپنی تقریری اساس کی بنا پر موضوع کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ دیگر ابعاد میں بھی وسعتوں کا امین ہے اور اس ایک مضمون میں کئی ایک موضوعات کو نبھانے کی کوشش کی گئی ہے، تاہم ہر جانب نگاہ دَوڑانے کے باوجود مصنف مرکزی خیال سے جڑے رہے اور اس کی کامیابی کا ثبوت ہے۔

''اقبال کی بیدل شناسی'' پچھلے مضمون کا پیرایہ اپنائے ہوئے ہے۔ تمہیدی گفتگو کے بعد مصنف نے اقبال کی شاعری، روزنامچے اور خطوط میں اذکارِ بیدل کے تسلسل کے باعث اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ بیسویں صدی میں برِعظیم میں رومی کے ساتھ بیدل شناسی، اقبال کی مرہونِ مطالعہ ہے۔ (ص ۹۳) ڈاکٹر صاحب نے اقبال کے بعض تصورات کے پس منظر میں افکارِ بیدل کی روشنی محسوس کی ہے۔ اقبال کی فکری تشکیل میں مختلف و متضاد سرچشموں کی کارفرمائی کسی سے مخفی نہیں، چنانچہ ان کے ہاں مارکس و مسولینی سے بھی عقیدت کا اظہار ملتا ہے، مگر اقبال ان شخصیات کے اُنھی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں، جن سے ان کے افکار کو تقویت ملتی ہے۔ یہی بات بیدل کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے کہ اُن کے بعض تصورات سے اقبال کو سروکار نہ ہونے کے باوجود کچھ پہلوؤں سے ان کی والہانہ وابستگی ہے۔ (ص ۹۸)

''اقبال اور تصوف'' میں مصنف نے تصوف اور شعر کے تعلق، نوجوانی میں اقبال کی وجودی تصوف سے وابستگی اور قیامِ یورپ کے دَوران عجمی تصوف کی حقیقت سے آگہی پر روشنی ڈالی ہے۔ ناتمام کتاب تاریخ تصوف اور اسرارِ خودی میں، نیز ہم عصروں کے نام متعدد خطوط میں اقبال نے وجودی تصوف کے بارے میں اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا ہے۔ اسرارِ خودی کی اشاعت پر اقبال کی مخالفت میں

لکھے گئے مضامین کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے کہ صوفیا کے مزعومات باقی رہے اور نہ ان کے قیل و قال، جب کہ اقبال کی صداقتیں صدیوں محفوظ رہیں گی۔ (ص ۱۰۷) ڈاکٹر صاحب نے فلسفہ وحدت الوجود کے ساتھ ساتھ ابن عربی سے متعلق اقبال کے ناقدانہ خیالات کو مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے، تاہم ان کے نتائج سے ان کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ نہیں ہوتا۔

مضمون 'اقبال کی تحریروں میں تحریف و تغیر کی تشویش ناک صورتیں' میں مصنف نے تحریر کی تقدیس اور انسانی مزاج کے باعث متن میں ہونے والی تحریف و تغیر پر دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ متن کی ناگزیریت کے اعتراف اور اس کی توصیف و تقدیس کے احترام سے انکار نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں کوائف حیات، فکر و نظر کی بازآفرینی اور تخلیق کے تناظر، اقبالیاتی تحقیق کے تین زاویے متعین کیے جا سکتے ہیں۔ حیاتِ اقبال سے تعلق کو بوجوہ نظرانداز کرتے ہوئے یہاں نظم و نثر کی بازآفرینی پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے مکاتیب میں در آنے والی تحریفات کا ذکر کیا ہے اور اس کی دو صورتیں بیان کی ہیں: اوّل، اصل متون کے پڑھنے اور نقل کرنے میں غفلت اور دوم، دانستہ طور پر جعل اور تحریف۔ شیخ اعجاز احمد اور ملک اشفاق بعض خطوط میں تحریف و تغیر کے مرتکب ہوئے اور لمعہ حیدر آبادی کے خطوط وضع کر کے شائع کرتے رہے۔ مصنف نے کلیاتِ مکاتیبِ اقبال میں مرتب (مظفر حسین برنی) کی سہل پسندی کے خوف ناک نتائج پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ فسادِ متن کی ایسی مکروہ مثالیں شاید ہی کہیں ملیں۔ (ص ۱۱۶) حالاں کہ مرتب نے خود کو "حریفِ مے مردافگنِ تحقیق" کہا ہے۔ مصنف نے اقبال کے متروک و منسوخ کلام پر مشتمل بعض مجموعوں سے الحاق و اضافے کی کئی مثالیں پیش کی ہیں، بالخصوص کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال میں پائی جانے والی سنگین متنی غلطیوں پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔ (ص ۱۲۰) اسی طرح بعض منظومات، غزلیات یا اشعار کے غلط زمانی انتساب نے بھی اقبال کے افکار کی تعیین میں ناقدین کو گم راہ کیا ہے۔ جہاں تک اقبال کے متداول کلام میں در آنے والی تبدیلیوں کا تعلق ہے، وہ بھی تشویش ناک ہیں۔ اقبال کے اردو اور فارسی کلیات میں منشائے مصنف کے خلاف، املائی صورتوں کی تبدیلیوں اور ترتیبِ کلام میں تغیرات پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے اسے تدوین کی گم راہ کن صورتِ حال قرار دیا ہے۔ (ص ۱۲۴)

کتاب کا یہ پہلا سنجیدہ اور تحقیقی مقالہ ہے، جس کا مطالعہ، قاری کے جذبات پر نہیں، بلکہ فہم پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مصنف نے مصادر کی فہرست دے کر مزید تحقیق کے در وا کر دیے ہیں۔

''اقبال اور نقدِ فراق کی نارسائی'' میں مصنف نے فراق کی شاعرانہ عظمت کو یہ کہہ کر تسلیم کیا ہے کہ فراق بشری محسوسات کی برگزیدگی کے لیے یاد کیے جائیں گے۔ شعری اظہار میں آدمِ خاکی کے لطیف جمالیاتی احساس اور اس کے مؤثرات کی بعض کیفیات کا ایسا دل نشیں اجتماع ماسوائے فراق ہماری روایت میں عمومیت سے خالی ہے۔ (ص ۱۲۷) اور اردو خدمات کو اس طرح خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ فراق اُسی ذہنی پس ماندگی

اور جذباتی درماندگی کے دَور کی یادگار ہیں، جب اردو سے انحراف ہی نہیں، استہزائی تنگنائی کے ساتھ اسے مسلمانوں سے وابستہ کیے جانے کی ہر امکانی سازش رچی جا رہی تھی۔ (ص۱۲۸) لیکن وہ انھیں تنقید کا مردِ میدان نہیں سمجھتے۔ (ص۱۳۰) چنانچہ مصنف نے اقبال پر فراق کی تنقیدی آرا کے پیش نظر رائے دی ہے کہ فراق کے انتقادی تصورات تعدیل وتوازن سے خالی ہی نہیں،تحقیر آمیز ہیں۔(ص۱۲۹)اس سلسلے میں مصنف نے فراق کے ذاتی تصورات، اخذِ نتائج کی عدم صحت، جذباتی مغلوبیت، معاصرانہ چشمک، سیاسی نقطہ نظر کی تنگ دامانی اور مصلحت کوشی کو مثالیں دے کر پیش کیا ہے اور نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ذوق و مصحفی اور عشقیہ شاعری پر فراق کی انتقادی اہمیت کے اقرار واعتراف کا دائرہ کم نہ ہوگا، مگر اقبال پر ان کی تنقید ایک بہت ہی محدود فکر کا واہمہ کہلائے گی، جو نقائص کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ (ص۱۳۹)

''کرتا ہے ترا جوشِ جنوں تیری قبا چاک'' میں مصنف، اقبال کو مقبولِ عام بنانے میں جگن ناتھ آزاد کی تصانیف کو اہم قرار دیتے ہیں، لیکن فکرِ اقبال کی تفہیم میں ان کے کردار کو تسلیم نہیں کرتے۔ آزاد کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے بتایا ہے کہ وہ مقدور بھر ہر مقام اور ہر لمحے کا احتساب اور منافع حاصل کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے، چنانچہ وہ شاعری میں مقام حاصل کر سکے اور نہ انتقادی ادب میں جگہ پیدا کر سکے۔ مصنف کا یہ کہنا بجا ہے کہ آزاد نے مصلحتوں اور مجبوریوں کی بنا پر اقبال شناسی کے کوچے میں قدم رکھا تھا۔ اس کے ثبوت میں کشمیر جانے سے پہلے اور کشمیر سے رخصتی کے بعد اقبالیات سے ان کی عدم دلچسپی کو پیش کیا ہے۔ کشمیر میں اقبال شناسی کے محرکات اور ان کی تمام ''علمی وادبی'' سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے بعد مضمون نگار لکھتے ہیں: کہ اقبال اور اس کا عہد سے لے کر اقبال اور کشمیر تک آزاد کی جملہ تصانیف شرر سے شعلہ تک رسائی میں ہماری مدد نہیں کرتیں؛ تاہم مصنف نے اقبال کو متعارف کرانے میں آزاد کی ناقابلِ فراموش خدمات کا اعتراف کیا ہے، بالخصوص اُس دَور میں، جب اقبال کے نام سے برادرانِ وطن کے ساتھ ترقی پسند طبقہ بھی نالاں وگریزاں تھا۔

''گذشتہ دہائی میں اقبالیات: ۱۹۹۲ء-۲۰۰۲ء'' میں مصنف نے دو صفحات پر محیط تمہیدی گفتگو کے بعد اقبالیات کو ضمنی عنوانات میں تقسیم کر کے باری باری ان پر تنقیدی نظر ڈالی ہے، لیکن اسے تنقیدی سے زیادہ سرسری کہا جانا چاہیے، کیوں کہ اس مختصر مضمون میں دس برسوں کی اقبالیاتی کاوشوں کو سمیٹنا، مصنف کے خیال میں 'صرفِ حرفِ تمنا' ہے۔ بہر حال ان کے بقول: اس عشرے کے تخلیق و تجزیے سے مطالعہ اقبال کی مقبولیت اور معنویت صاحب نظر کے مشاہدہ وادراک کو نُور و حضور بخشتی ہے۔ یہ حقیقت ماہ وسال کی ہر دہائی سے مربوط ہی نہیں، بلکہ افزونی اور توسیع کی طلب گار رہتی ہے۔ تفہیم وتجزیہ کا یہ تسلسل ماورائے اقبالیات محدود ہے اور مفقود بھی۔ یہ مطالعہ مرکزِ پُرکار کی مانند ہے۔ اس بدیہی حقیقت کی بنیاد پر موضوعِ سخن کو زمان ومکاں کے تعینات میں متحصر نہیں کہا جا سکتا۔ (ص۱۶۲) یہ مضمون تحقیقی بنیادوں پر نہیں، تنقیدی آرا پر مشتمل ہے اور وہ بھی زیادہ تر تاثراتی، چنانچہ بعض مقامات خطابیہ لب ولہجے کے حامل ہیں اور بعض مقامات پر تقریر کی رَو میں بہہ جانے کی کیفیت بھی ظاہر ہوئی ہے۔

''علی گڑھ میں اقبالیات'' کو مصنف نے ''سرسید یا علی گڑھ تحریک سے اقبال کی فکری و ذہنی قربت، اقرار و اعتراف اور استفادے''، ''علمی و عملی طور پر علی گڑھ سے اقبال کی وابستگی اور اشتراک و تعاون'' اور ''علی گڑھ کے احباب و اساتذہ کی اقبال شناسی اور باز آفرینی'' میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دو مقدمات پر چند اشارے دینے کے بعد مصنف نے علی گڑھ میں اقبالیاتی سرگرمیوں اور تصنیف و تالیف کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ مصنف نے تقسیم ہند کے بعد مطالعہ اقبال کے حوالے سے نامساعد حالات میں رشید احمد صدیقی اور آلِ احمد سرور کی اقبالیاتی خدمات کو سراہا ہے اور ساتھ ساتھ مجنوں گورکھ پوری اور علی سردار جعفری جیسے نقادوں کا بھی ذکر کیا ہے، جن کا سفر اقبال کی مخالفت اور انجام اعتراف کے ساتھ ہوا۔ علی گڑھ میں جدیدیت، ساختیات، مصطلحات اور تخلیقی وفور کے باعث فکرِ اقبال پر عدم توجہی پر مصنف کو افسوس ہے، لیکن وہ اس صورتِ حال سے مایوس نہیں۔

''ابلیس کی شورائی مجلسیں'' کا بنیادی خاکہ ''گذشتہ دہائی میں اقبالیات'' میں دیا جا چکا ہے۔ فکر و فلسفہ سے قطع نظر اقبال کے شعری اکتسابات کی حدود کے احاطے کی مشکلات کے ذکر کے بعد مصنف نے اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' (۱۹۳۶ء) کی طرز پر لکھی گئی اردو کی دیگر نظموں کا تعارف کرایا ہے۔ ان نظموں میں کیفی اعظمی (۶۰/اشعار)، پروفیسر محمد حسن (۳۱/اشعار)، سید غلام سمنان (۱۳۰/اشعار) اور فنا پرتاب گڑھ (۱۹/اشعار) کی نظموں کا فکری جائزہ لیا ہے۔ مصنف نے ان چار نظموں کے ذکر کے بعد مفروضہ قائم کیا ہے کہ اقبال ہر دَور کے شعر و فن کی سیرابی کرتے رہیں گے اور تخلیق کے امکانی جہات کی نشان دہی میں چراغِ راہ گزر کا کام انجام دیں گے۔ (ص ۱۸۰)

ڈاکٹر عبدالحق کی یہ قابلِ ذکر کتاب اگرچہ بہت سی خوبیوں کی حامل ہے، مگر چند ایک مقامات پر مصنف کی بعض معلومات محلِ نظر ہیں، مثلاً صفحہ ۱۵۱ پر *Stray Reflection* کے ترجمے کو ڈاکٹر تحسین فراقی سے منسوب کرتے ہوئے اس کی اشاعت کی اطلاع دینا اور کتاب کے تین صفحات ۱۱۳، ۱۵۷ اور ۱۶۹ پر خطوطِ اقبال کی تعداد بالترتیب: سولہ سو سے زائد، تقریباً چودہ سو اور تیرہ سو سے زائد بتانا۔

کتاب کا اسلوب گاڑھی علمیت سے مملو ہے اور قاری مصنف کے خیالات سے زیادہ عبارت کی رنگینی سے مرعوب ہوتا ہے۔ چونکہ یہ مضامین مذاکروں اور سیمیناروں کے لیے لکھے گئے تھے، لہٰذا ان میں سامعین کی توجہ حاصل کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ کتابی صورت دینے سے پہلے ان تحریروں پر سامعین کی بجائے قارئین کے نقطۂ نظر سے توجہ دی جاتی تو اس کی افادیت میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ البتہ اقبال کے بارے میں مصنف کی دردمندی قابلِ تحسین ہے اور ان کی وسعتِ معلومات حیران کن۔ اپنے مطالعے کو منضبط صورت میں پیش کرنے کا ہُنر انھیں اُن دیگر اقبال شناسوں کے مقابلے میں منفرد بنا دیتا ہے، جو قارئین کو خام معلومات تو فراہم کر دیتے ہیں، لیکن ان کے قلب و رُوح میں افکارِ اقبال کی حرارت پیدا نہیں کر سکتے۔

❁......❁......❁